صرف قرآن ہی حجت نہیں تحویل قبلہ کے سلسلہ میں یہ بات نہایت درجہ عبرت آموز ہے کہ دین صرف کتاب اللہ کا نام نہیں، ذوقِ صاحب قرآن بھی حجت ہے۔ نبوت کی نقش آرائیاں بھی اس میں داخل ہیں اور عند اللہ قابل لحاظ صرف قرآن حکیم کی آیات منصوص اور کلمات و حروف ہی نہیں، بلکہ قلب نبوت کی بے چینیاں اور ضمیر رسالت کی خلشیں بھی شائستہ التفات ہیں، یہی سبب ہے کہ تغییر قبلہ کی اہمیتوں کو سب سے پہلے جس نے بھانپا وہ چشم جبریل نہیں بلکہ جناب رسالتمآبؐ کی ذات گرامی ہے، اس کے بعد مشیت ایزدی نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اس سے اس عامۃ الورود بہلاوے کی بھی تردید ہو جاتی ہے، کہ احکام و مسائل میں بہرحال پہلے قرآن کا نام نامی آئیگا۔ اس کی تصریحات کے بعد اگر ضرورت محسوس ہو، تو احادیث سے رجوع ہوگا۔ گویا نبوت و رسالت بجائے خود حجت و سند نہیں۔ حجت و سند صرف پیغام ہے۔ ان آیات نے صاف صاف بتا دیا کہ پہلے پیچھے اور تقدم و تاخر کے یہ مدارج کچھ ضروری نہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک حقیقت نے اوّل اوّل سینۂ پیغمبر میں کروٹ لی اور اس کے بعد اس کا نزول ہوا۔ یا پہلے پہل آنحضرتؐ کی چشم بصیرت پر کچھ امور بالاجمال منکشف ہوئے، اور تفصیلات بعد میں مرتب ہوئیں۔ یہ ذہن کہ پیغمبر کا تعلق کتاب سے بس صرف اتنا ہی ہوتا ہے، کہ وہ من و عن اس کو پہنچا دینے کا ذمہ دار ہے، غیر قرآنی ہے جس کو محض سطحیت اور اتھلے پن نے جنم دیا ہے۔ ورنہ جو شخص بھی مناظرانہ طرز فکر سے علیحدہ ہو کر غور کریگا۔ وہ اس نتیجہ تک پہنچ کر رہیگا۔ کہ نبوت قرآن کے نقطہ نظر سے کوئی مکانکی چیز نہیں کہ ادھر کوئی آیت نازل ہوئی اور ادھر کھٹ سے مسلمانوں تک پہنچا دی گئی۔ بلکہ ایک ایسی شئی سے تعبیر ہے، جو پیغمبر کے ذوق، فکر، امیال و لطائف اور روزمرہ کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہونے والی ہے۔ اس سے ضمیر نبوت میں جلا اور نور پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق و کردار کی زلفیں سنورتی ہیں اور فکر و عمل میں نمونے ابھرتے ہیں۔ پیغمبر قرآن کے نقطہ نظر سے محض ایک آلہ ترسیل نہیں جیسا کہ بعض کوتاہ اندیش سمجھتے ہیں۔ بلکہ لطائف دین کا پیکر حسین ہے جس میں ان تمام خوبیوں کو سمو دیا گیا ہے، جن کی عالم بشری کو احتیاج ہے۔ الفاظ و حروف پر مٹنے والوں کو ان حقائق پر غور کرنا چاہیئے اور ایسی نئی جمانی اور تشریح پر شرمانا چاہیئے، جو منشاء قرآنی کے قطعی خلاف ہے۔

حکمتِ رومی

مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار و نظریات ایسے دائمی حقائق ہیں جن کی اہمیت اور قدر و قیمت میں گردشِ زمانہ کوئی کمی نہ کر سکی اور انکی مثنوی سے جس کو "قرآن در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے علامہ اقبال بھی ویسے ہی متاثر ہوئے جیسے کہ مولانا جامی۔ حکمتِ رومی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی بلند پایہ تصنیف ہے جو ماہیت نفسِ انسانی، عشق و عقل، وحی و الہام، وحدتِ وجود، احترام آدم، صورت و معنی، عالم اسباب اور جبر و قدر۔ جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے، اور خلیفہ صاحب نے مولانائے رُوم کے افکار کا دوسرے حکماء کے خیالات سے موازنہ کرتے ہوئے انکی حکیمانہ تشریح کی ہے قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ: سکریٹری۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور۔ (پاکستان)

محمد جعفر شاہ ندوی

ایک حدیث

ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت ابو درداء سے ایک حدیث یوں مروی ہے :

الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام الصلوٰۃ والصدقۃ ؟ قالوا بلیٰ ! قال صلاح ذات البین فان فساد ذات البین ھی الحالقۃ ۔

میں تمھیں ایک ایسی چیز بتا دوں جو صیام، صلوٰۃ اور صدقے سے بھی افضل ہے ؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ضرور ارشاد ہو۔ حضورؐ نے فرمایا : باہم صلح رکھنا کیونکہ باہمی فساد تباہ کن چیز ہے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی، صمد اور بے نیاز ہے ۔ اس کو ہماری عبادتوں کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اگر ساری دُنیا ابوجہل بن جائے، تو خدا کی خدائی میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں آئے گا اور اگر ساری مخلوق ابوبکر صدیق بن جائے تو خدا کی عزت میں رائی برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا ۔ خدا کی خدائی آپ اپنے زور پر قائم ہے ۔ اس کا قیام ہمارے روٹیوں کے بل پر نہیں عبادات کا فائدہ خدا کو نہیں پہنچتا اس کا فائدہ خود بندوں کو ہوتا ہے ۔ عبادات کا ایک تو وہ محدود تصوّر ہے جسے مراسم پرستش یا پوجا اور بھگتی کہتے ہیں اور اس کے لئے زیادہ موزوں لفظ "منسک" ہے جس کی جمع مناسک ہے، اور دوسرا وہ اعلیٰ اور وسیع مفہوم ہے جس کا تعلق پوری زندگی کی ہر حرکت و سکون سے ہے ۔ ان دونوں مفہوموں میں عبادت کے تمام فوائد و ثمرات گھوم پھر کر بندوں ہی کو حاصل ہوتے ہیں ۔ خدا کو اس سے کوئی نفع نہیں حاصل ہوتا ۔ پس کسی عمل عبادت کے صحیح یا غلط ہونے کا مقیاس ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ خود صاحب عبادت کو اور خدا کے دوسرے بندوں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا ۔ نفعے ہزاروں طرح کے ہوتے ہیں ۔ ذہنی، فکری، اخلاقی، مالی، علمی وغیرہ اگر ان میں سے کوئی روحانی یا مادّی فائدہ نہ اپنے آپ کو پہنچتا ہو نہ کسی دوسرے کو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ عبادات یعنی مناسک اپنی رسمی شکل میں تو موجود ہیں لیکن ان کی روح نکل چکی ہے ۔

مناسک کا سب سے بڑا مقصد اخلاقی اقدار کا قیام ہے ۔ نماز کے متعلق ارشادِ باری ہے کہ :

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر

نماز فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہے

روزے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ :

لعلکم تتقون : اُمید ہے کہ تم تقوے کی زندگی حاصل کر سکو گے ۔

حج کا سب سے زیادہ ضروری جزو یوں بیان کیا گیا ہے کہ :

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج -

حج کے موقعہ پر کوئی بیہودگی، فسق اور جھگڑا نہ ہو -

اور زکوٰۃ کا تو لفظ ہی ایسا ہے جس کے مفہوم ہی میں روحانی و اخلاقی بالیدگی داخل ہے -

اگر یہ اخلاقی، روحانی فوائد (ثواب) حاصل نہ ہوں تو مناسک محض بے روح رسم ہیں اور ان کا ثواب بھی محض خیالی ہے - دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ یہ مناسک خود مقصود نہیں، مقصود وہ اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں جو ان سے حاصل ہوتی ہیں - لہٰذا مناسک صرف وسیلہ ہیں اور اخلاقی اقدار کا حصول ان کا مقصد - اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مقصد وسائل سے اعلیٰ و افضل ہوتے ہیں اور یہی حقیقت زیر بحث حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ صوم و صلوٰۃ و صدقہ سے بھی زیادہ افضل چیز ہے - صلاح ذات البین یعنی باہمی میل جول، خوشگوار تعلقات، صلح و صلاح - اگر اس فرمان نبویؐ کے تناسخ کو ہم بیان کریں تو وہ یوں ہوں گے :

مناسک ادا کرنے والے سے باہم صلح رکھنے والا زیادہ افضل ہے - یا یوں کہیئے کہ مناسک کو ترک کرنے والے سے باہم فساد کرنے والا زیادہ بڑا مجرم ہے -

ایسا کیوں ہے ؟ اسے اگلے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ فساد ذات البین (باہمی فساد کرنا) تباہ کن ہے یعنی مناسک کے ترک کو حالقہ (تباہ کن چیز) نہیں کہا گیا ہے لیکن فساد باہمی کو حالقہ فرمایا گیا ہے - اب دونوں باتوں کو ملا کر دیکھئے تو ہماری قوم کے چار طبقے ہوتے ہیں :

(۱) ایک وہ طبقہ ہے جو ناسک (مناسک ادا کرنے والا) بھی ہے اور صلح جو بھی ہے -

(۲) دوسرا وہ جو ناسک مگر فسادی ہے -

(۳) تیسرا ناسک مگر صلح پسند

(۴) چوتھا ناسک اور فسادی -

پہلا طبقہ اہل اللہ یا علمائے ربانی کا ہے جو خال خال کہیں نظر آتا ہے - دوسرا طبقہ ملاؤں کا ہے، جو مناسک پر خوب زور دیتا ہے لیکن ہر جگہ لایعنی مسائل کو مذہب بنا کر مسلمانوں کی تکفیر کرتا ہے، بلکہ کشت و خون تک کرا دیتا ہے امت میں تفریق و انتشار پھیلاتا ہے اور فرقہ بندی کی آگ قوم میں بھڑکاتا رہتا ہے - تیسرا طبقہ ان نیک مزاجوں کا ہے جو مذہب سے تعلق نہیں رکھتا مگر طبیعت میں سلامت روی اور صلح پسندی ہے، اور چوتھا طبقہ ان سیاسی لیڈروں کا ہے جو مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے (اگرچہ "اسلام اسلام" خوب چلاتے رہتے ہیں) اور مذہب کی بجائے سیاست کے ذریعے امت میں انتشار و تفریق پھیلاتے رہتے ہیں، سیاسی پارٹی بازی میں اپنی ساری انرجی صرف کرتے رہتے

ہیں، اپنی ساری قوتیں تعمیر کی بجائے تخریب میں صرف کرتے ہیں۔

ان چاروں طبقوں کو سامنے رکھنے کے بعد اس میں تو کوئی شبہہ ہی نہیں رہتا کہ سب سے اعلیٰ اور شریف طبقہ وہ ہے جو پہلے نمبر پر ہے اور بدترین طبقہ وہ ہے جو چوتھے نمبر پر ہے۔ ہاں ۲ اور ۳ میں یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں بدتر طبقہ کونسا ہے۔ ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ ناسک فسادی غیر ناسک صلح پسند سے کہیں بدتر ہے۔ اور غیر ناسک فسادی طبقہ تو انسانیت کے لئے ناسور ہے۔ ناسک فسادی کو یہی استعمال کرتا ہے اور یہی اس سے اپنی ایجنسی کا کام لیتا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ سے یہی دو طبقے مفسدہ پرداز، ننگ انسانیت اور استحصالی (EXPLOITER) رہے ہیں۔ ان ہی دو وظائف کا نام ملوکیت اور پیشوائیت ہے۔ یہ الگ الگ کریلے اور نیم ہیں اور جب دونوں مل جاتے ہیں ـــــ اور تاریخ میں عموماً ایسا ہی ہوتا رہا ہے ـــــ تو یہ کریلا نیم چڑھا ہو جاتا ہے۔ کام دونوں کے یکساں ہیں، صرف راہیں مختلف ہیں۔ ایک کی راہ مذہبی ہے اور دوسرے کی سیاسی۔ اقبالؒ نے ان ہی دو فتنوں سے عاجز آکر کہا تھا کہ ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

امتِ محمدیہ میں جب بھی "حالقہ" یعنی تباہی آئی تو اس کا سبب یہی دو ہوئے ہیں اور اُمّت کو سنبھالنے والا ہمیشہ وہ طبقہ ۱ ہوا ہے جن کو ہم اہل اللہ یا علمائے ربانی کہتے ہیں۔ یہ اگر بوریہ نشین درویش ہوئے ہیں جب بھی دینی قدروں کی کمال محافظت کی ہے اور اگر تخت نشین فرمانروا ہوئے ہیں جب بھی دین اور اہلِ دین کو "حالقے" سے بچا لیا ہے۔ ان کی آواز پر ان دو مذکورہ طبقوں (۲ و ۳) نے کبھی لبیک نہیں کہی۔ عموماً ان کی آواز پر طبقہ ۳ ہی نے نحن انصار اللہ کہا ہے۔

ہم نے طبقہ ۲ (ناسک فسادی) کو طبقہ ۳ (غیر ناسک صلح پسند) سے زیادہ بُرا قرار دیا ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔ ثانی الذکر میں قبولِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن اوّل الذکر تو یہ یقین کئے بیٹھا ہوتا ہے کہ ہم جہاں ہیں بالکل ٹھیک ہیں۔ اس کی فطرت کچھ ایسی مسخ ہو چکی ہوتی ہے کہ قبولِ حق کی صلاحیت اس کے اندر تقریباً مفقود ہو چکی ہوتی ہے۔ غیر ناسک فسادی (یعنی طبقہ ۳) کی طرح اس کا مفاد بھی فساد ہی سے وابستہ ہوتا ہے۔

دوسری وجہ (۲ کو ۳ سے بدتر ماننے کی) یہ ہے کہ ۳ بے روح مناسک تو ادا کرتا ہے لیکن مقصود حاصل نہیں کرتا اور ۳ اگرچہ مناسک نہیں ادا کرتا لیکن مقصد اسے حاصل ہوتا ہے۔ وہ صورت پرست مگر بے روح ہوتا ہے اور یہ بے صورت معنی نواز ہوتا ہے۔ حضور صلعم کا ایک فیصلہ تقریباً اسی طرح کا ہے۔ مالک سے ابوداؤد میں حضورؐ کا ایک فرمان یوں مروی ہے کہ:

ان المؤمن لیدرک بحسن خلقہ درجۃ الصائم القائم

مومن محض اپنے حسنِ خلق سے صائم النہار اور شب بیدار کا درجہ حاصل کر لیتا ہے

مناسک اور اخلاقی اقدار کے اس فرق کو ایک اور حدیث میں بھی یوں واضح کیا گیا ہے :

قال رجل یارسول اللہ ان فلانۃ تذکر من کثرۃ صلاتہا وصدقتہا و صیامہا غیر انہا تؤذی جیرانہا بلسانہا، قال ھی فی النار۔ قال یارسول اللہ ان فلانۃ تذکر من قلۃ صیامہا وصلاتہا وانہا تصدق بالاثوار من الاقط ولا تؤذی بلسانہا جیرانہا، قال ھی فی الجنۃ (رواہ احمد والبزار عن ابی ہریرۃ)

ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ایک عورت ہے جس کی صلوٰۃ، صدقہ اور صوم کی کثرت کی شہرت ہے، مگر وہ اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو ایذا پہنچاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہے۔ پھر اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ایک دوسری عورت ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ روزے نماز سے کمتر ہی تعلق رکھتی ہے اور صرف پنیر کے ٹکڑے صدقے میں دیتی ہے، لیکن اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو دُکھ نہیں دیتی۔ فرمایا: وُہ جنتی ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے اخلاقی زندگی کی قدر و قیمت مناسک کی ادائیگی سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک شخص واجبی سے مناسک ادا کرے لیکن اخلاق بہتر رکھے تو وہ عنداللہ مقبول ہے۔ بخلاف اسکے کہ کوئی مناسک کی خوب پابندی کرنے کے باوجود اخلاق کو نہیں سدھارتا تو اس کے مناسک بے قیمت ہیں۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ یہاں صرف زبانی ایذا رسانی کا ذکر ہے جو ایک عورت کے تمام مناسک کو غارت کرکے اسے جہنّم میں لے جاتی ہے۔ پھر یہ کیونکر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے بہت بڑے اخلاقی جرم —— تکفیرِ مسلمین، تفریقِ دین، فساد فی الامّت وغیرہ —— کے ہوتے ہوئے صرف مناسک کی ادائیگی موجبِ نجات ہو جائیگی؟ مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ نے ایسے بے روح مناسک و عبادات کے متعلق کیا مزے کی بات فرمائی ہے۔ رباعی ؎

اے فسق و فجور کارِ ہر روزۂ ما وے پُر ز گناہ کاسۂ و کوزۂ ما
ناخستہ درون زنگار و می گوید عمر بہ طاعت و بہ نماز و بہ روزۂ ما

ذرا خیال کیجئے کہ صرف اتنی سی بات سے کہ وہ عورت اپنی زبان سے کسی کا دل نہیں دُکھاتی، اپنی قلتِ صوم و صلوٰۃ کے باوجود جنتی ہے تو اس شخص کا کیا ٹھکانا ہے جو اپنی زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، اپنے دل و دماغ، اپنی جان و مال سے نہ فقط یہ کہ کسی کو دُکھ نہ دے بلکہ راحت و نفع پہنچائے۔ اسی کے متعلق تو بلا تامل یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ غیر ناسک بھی ہو تو اس ناسک سے بدرجہا بہتر ہے جو اخلاقی اقدار سے تہی دست ہو۔

سوال وجواب

تعدّدِ ازواج کے مضمون پر ایک شبہے کا ازالہ

محمد الیاس صاحب کراچی سے لکھتے ہیں:

سورۃ النساء کی ایک آیت: (وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمی فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلث وربع ... الخ

یعنی اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتوں میں جو تمہیں پسند آئیں اُن سے دو، تین، چار تک سے نکاح کر لو۔) سے پہلے یہ آیت ہے کہ:

(واتوا الیتمی اموالھم ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب ولا تاکلوا اموالھم الی اموالکم انہ کان حوبا کبیرا o

یتیموں کو انکے مال دے دو۔ اور اچھے کو بُرے سے نہ بدلو اور اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال نہ اڑاؤ۔ یہ بڑا سخت گناہ ہے) اور بعد میں یہ آیت ہے کہ:

واتوا النساء صدقتھن نحلۃ فان طبن لکم عن شیٔ منہ نفسا فکلوہ ھنیٔا مریٔا

عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی کے ساتھ دو۔ ہاں اگر کچھ حصّہ وہ اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو اسے مزے میں کھاؤ۔

ان دونوں آیتوں کے درمیان وہ آیت ہے۔ یعنی وان خفتم الا تقسطوا۔الخ — جس کی آپ نے تفسیر یوں کی ہے کہ بعد از جنگ جب یتامیٰ کی تعداد بڑھ جائے تو ان کی ماؤں بہنوں سے شادیاں کرلو ....

سوال یہ ہے کہ قرآنی سیاق وسباق بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ آیت سے پہلے مال کا ذکر، آیت کے بعد مال اور مہر کا ذکر۔ جنگ کا نہ پہلے کی آیت میں کوئی ذکر ہے نہ بعد کی آیت میں۔ اس لئے نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہے کہ جو تفسیر حضرت عائشہؓ نے کی ہے وہی صحیح ہے یعنی یہ خطاب یتامیٰ کے اولیا سے ہے کہ تم محض ان کے مال وجمال کی وجہ سے قلیل مہر پر نکاح کرنا چاہتے ہو، یہ نہ کرو بلکہ اگر کرنا ہی ہے تو دوسری عورتوں سے چار تک کرو (بشرط عدل) مگر ان یتیم لڑکیوں کی حق تلفی نہ کرو۔

ثقافت: ہمارے نزدیک قرآنی سیاق وسباق شانِ نزول کی روایات سے بھی زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ سلسلہ کلام فی الواقع یتامیٰ کے مالی ومعاشی ہی مسائل سے تعلق رکھتا ہے لیکن کیا ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آگے پیچھے اس کا کہاں ذکر ہے کہ اولیائے یتامیٰ

مال و جمال کی وجہ سے خود ہی نکاح کرنا چاہتے تھے اور مہر کم رکھتے تھے؟ مہر کا تعلق تو آیت میں ان عورتوں سے ہے جو (بقول آپ کے) ان یتامیٰ کے علاوہ ہیں۔ پس اگر مہر پورا ہی دینا ہے تو ان یتیم لڑکیوں سے ہی نکاح کرنے سے کونسا حکم قرآنی مانع ہے؟ آپ کی تفسیر کے لحاظ سے تو حکم قرآنی یوں ہونا چاہیئے تھا کہ:

اگر تم ان یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنا چاہتے ہو تو ان کا مہر پورا رکھو، ورنہ ان سے نکاح مت کرو۔

یا یوں ہوتا کہ:

اگر تمہیں ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں مالی بے عدلی کا اندیشہ ہو تو ان کے ولی ہونے کی ذمے داری ہی نہ لو۔

اس کا کیا مطلب ہوا کہ:

اگر تمہیں یتامیٰ کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو دوسری عورتوں سے چار تک شادیاں کر لو۔ (بشرطِ عدل)

اس سے زیادہ بہتر شکل تو یہ ہے کہ:

اگر تمہیں یتامیٰ کے متعلق مالی بے عدلی کا خطرہ ہے تو ان ہی یتیم لڑکیوں سے (بعد از بلوغ) چار تک شادیاں کر لو (بشرطِ عدل) تاکہ بیوی ہو جانے کی وجہ سے تم ان کے مال میں تصرف نہ کر سکو۔

سوچنے کی بات ہے کہ مال و جمال کی وجہ سے نکاح کرنا کون سا ایسا جرم ہے جو یتیم لڑکیوں سے تو ناجائز ہو اور دوسری عورتوں سے جائز ٹھہرے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ خطاب اولیائے یتامیٰ سے نہیں بلکہ معاشرے سے ہے۔ اولیا سے یہ خطاب اس لئے نہیں کہ اولیا کے متعلق یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ ان یتیم لڑکیوں سے نکاح کریں گے۔ از روئے فقہ یتیم کے اولیا مرد نہیں ہیں:

دادا، چچا، حقیقی بھائی، سوتیلا بھائی، حقیقی بھتیجا، سوتیلا بھتیجا، حقیقی چچا، سوتیلا چچا، حقیقی چچا کا لڑکا، سوتیلے چچا کا لڑکا، باپ کا حقیقی یا سوتیلا چچا۔ باپ کے حقیقی یا سوتیلے چچا کا لڑکا، دادا کے حقیقی ورنہ سوتیلے چچا کا لڑکا، ان دونوں کا لڑکا علی الترتیب نانا، اخیافی بھائی اور اس کا فرزند، ماموں۔

عورتوں میں: ماں، دادی، نانی حقیقی اور سوتیلی اور اخیافی بہن، پھوپھی، خالہ۔

ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ یتیم لڑکی کی سرپرستی کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ کہنا صرف یہ ہے کہ ان تمام رشتے داروں میں بجز عم زاد بھائی کے اور کسی سے نکاح ہی نہیں ہو سکتا یا تو اس لئے کہ یہ رشتے ہی حرام ہیں، یا اس لئے کہ فطرت کے خلاف ہے۔ یعنی یتیمہ کو عورت نکاح میں نہیں لا سکتی۔ باپ یا دادا کا حقیقی یا سوتیلا چچا اس وقت تک زندہ نہیں رہتا یا اگر زندہ رہے تو دواعی نکاح ختم ہو چکتے ہیں۔